

۱۹۶۵ء کی

بہترین  
نظریں

ترب

انور سدید

۱۹۶۵ء

کی  
ہم تین ناظمیں

مرتب  
الورسید

مکتبہ اردو زبان، ریلوے روڈ سرگودھا

طبع	اول
تعداد	پانچ سو
کتابت	تمکین شیرازی
ناشر	نھرت الوار
مطبع	الوفا پرنٹنگ پرنس لاهور
طبع	مکتبہ ردو زبان سرگودھا۔

ماہ و سال اشاعت، اپریل ۱۹۶۷ء

قیمت

پچھروپے

ن-م-راشد

اور

مجید احمد

کے نام

”زیں کھاگئی آسمان کیسے کیے“

# رسائل

## جن سے استفادہ کیا گیا

شکلیق	لارا	اوراق
جامن لو	کراچی	نیادور
اردو ڈائجسٹ	کراچی	سیدپ
لارا	لارا	فنون
		پاکستانی ادب
	کراچی	کراچی
	کراچی	افکار
	کراچی	الفاظ
	لارا	سورا
	لارا	تحریریں
	پشاور	قند
نیرنگ خیال	راولپنڈی	
	کراچی	الشجر
	حربر آباد	نسی فتدریں

# بہترین نظمیں

۹

پیش لفظ

الورسید

۲۱

نیا آدمی

ن۔م۔راشد

۲۲

پہار آئی

فیض احمد فیض

۲۴

سرخ ہوا

صیا جالمدھری

۲۸

دست بستہ کھڑا ہوں

وزیر آغا

۳۲

چراخ کا گھاؤ

عارف عبدالمتین

۳۷

پھڑاؤ

بلراج کومل

۳۶

برفت باری

شا ذ تمکنت

۳۸

اپنی مٹی کی خوشبو

عرش صدیقی

۳۹

داستان در داستان

اعجاز فاروقی

۴۰

نظم

محمد سلیمان الرحمن

۴۶	اجنبی سمت در	بیش رواز
۴۹	رو میں ہے رخش عمر	کرشن ادیب
۵۱	داع پانی کے	ادیب سہیل
۵۳	نظم	زامہ دار
۵۸	نظم	ذوالفقار احمد تالیش
۶۰	دیک	سحر الصاری
۶۲	جسم کے اندر جسم کے باہر	تلہسکم کاشمیری
۶۷	منافق دوستوں کے لئے ایک نظم	اظہر جاوید
۶۶	گلہ	احمد اسلام احمد
۶۹	ایک موسم کے دوستور کے لئے نظم	سہیل احمد
۷۲	ناچ لئے زریکی	سرمد صہیبائی
۷۴	دائی رفاقت کی پشارت	ریاض مجید
۷۸	دس دن پہلے	انور محمود خالد
۸۱	چاگکتی مسٹی	فہیدہ ریاض
۸۲	صحیح کی دعا	سرور کامران
۸۶	خانہ بدوش	ناہمید قاسمی
۸۹	کوئی دود سے بن جاتا ہے وہ جو	حاء حسیلائی
۹۱	بانیسوں صلیب	پرونین شاکر
۹۴	نیلے پھاڑ	خورشید رضوی

۹۸

سامنہ

سچا و با بر

۱۰۰

زندہ رہنے کی کوشش

آذر تھنا

۱۰۲

اپنی موت پر ایک نظم

اصغر ندیم سید

۱۰۵

راہباؤں کے نام

ظفر سلطان

## نوہ

۱۰۶

نسیم شماٹل پوری کی یاد میں

جمیل مک

۱۰۹

اپنی ذات کا لوحہ

اسرار زیدی

۱۱۱

مجید امجد کے لئے ایک سوز

مسعود منور



## پیش لفظ

اردو ادب کے اس واقعے نے ابھی تک بہت سے لوگوں کو لچینے میں  
 ڈال رکھا ہے کہ ما صنی قریب میں نظم کے چند بہترین شعرا اچانک غزل کی طرف  
 کیوں متوجہ ہو گئے۔ بیشتر شعرا نے تو قاری کی اس حیرت کو اہمیت نہیں دی تاہم  
 چند ایک شعرا نے اس مراجعت کی وضاحت ضروری سمجھی اور تباہ کہ ایک  
 طویل عرصے تک سچلی منزل میں سالنس یعنے کے بعد اب دہ وسیع نر زندگی کا مشاہدہ  
 پالائی منزل سے کرنے کے آرزو مند ہیں۔ نظم سے غزل کی طرف اس مراجعت کا فائدہ  
 یہ ہوا کہ اردو غزل جو ناصر کاظمی اور شکیب جلالی کی وفات کے بعد ایک عارضی انجماد  
 کی رو میں آچکی بھی ہوا کے اس تازہ جھونکے سے پھر کھل اٹھی اور اس میں موضوعات  
 کا تنوع ہی پیدا نہ ہوا بلکہ نظم کے شعرا نے اس کی موضوعی ہمیت کو بھی نکیسہ بدال ڈالا  
 اور ایسے رجحانات کی عکاسی کبھی ہونے لگی جنہیں اس سے قبل صرف نظم کی قسم  
 سخن میں، ہی داخلے کی اجازت بھی اور اردو غزل کی عمومیت جنہیں قبول کرنے سے  
 گزیاں بھی۔ دوسری طرف لفظان یہ ہوا کہ اردو نظم پر غزل کو فروخت دینے کا رجحان  
 ایک مرتبہ پھر اہمیت حاصل کرنے لگا اور نظم مبینہ طور پر بقول شخصی انحطاط و زوال

کا نونہ پیش کرنے لگی۔

اس زمانے میں ادب کے ثقہ مراکز سے جو نفرہ یا مدنہ ہوا وہ بالواسطہ طور پر تو غزل کی حایت میں ہی تھا لیکن اس کی زد پر پڑا وہ راستِ نظم کے شراء آئے اور انہیں متنبیہ کیا گیا کہ گزشتہ چند سالوں میں اچھی نظم تخلیق نہیں ہوئی۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اس اہم حادثے کی ادبی اور نقیاتی دجوہ تلاش کی جائیں اور معلوم کیا جاتا کہ کر نظم کا تخلیقی عمل واقعی کرنا درپڑ گیا ہے یا نظم پر معاشرے کی عمومی حالت اثر انداز ہو رہی ہے اور شاعر صرف دھنڈ لی چیزوں کو دیکھنے میں مصروف ہے اور ذات کی غرّاں کی طرف متوجہ نہیں ہو رہا۔ لیکن ہوا یہ کہ نفرہ تاثر کی خطوط و حدائق میں ٹیکا دوڑ کی فضائیں گو نجات رہا اور دجوہ تلاش کرنے کی طرف توجہ منعطف نہ ہو سکی

تا ریجی اعتبار سے دیکھئے تو یہ وہی زمانہ ہے جب نئے رجحانات نئے خیالات اور نئے تصورات کو پروان چڑھانے والے ادبی پرچے ایک مخصوص بیانی ادبی گروہ کی ذاتی الزام تراشیوں کی تاب نہ لکر بالآخر ان کے منفی روئے کے لئے پرڈال پکے لختے اور میدان ان رسائل کے ہاتھ میں تھا جو ادب کو مقصد کے باوجود کے مطلبی استعمال کرنے کی سعی کرتے ہیں اور مشاعرے میں جو دادا بھرتی ہے اسے شعر کا معیار تصور کرتے ہیں بنتی چھ یہ ہو اکہ نئے تصورات کا دھارا اشاعت سے محروم ہو گیا اور قاری اس شاعری سے ماؤں ہونے لگا جن میں پروپگنڈا سلطی انداز اختیار کر لیتا ہے اور قاری کو صرف ایک خاص انداز میں ہی منتاثر کرنا ہے۔

گری ایک صحفتِ سخن کا دوسرا صحفتِ سخن پر مسابقت حاصل کرنے کا رجحان خارجی جبرا اور ادبی منصوبہ بندی کے بر عکس آزادا نہ اور فطری ہو تو چنان خطرناک

نہیں ہوتا اور خوشی کی بات یہ ہے کہ اردو نظم کے شعرا نے غزل کی طرف مراجعت منصوبہ پندی کے بر عکس ایک وجدانی کیفیت کے زیر اثر کی اور یہی وجہ ہے کہ ان کے فن نے غزل کے جن نئے گوشوں کو ابھارا ان کی پذیرائی زیادہ ہوتی اور نظم کے خلاف بوجفرہ اٹھایا گیا وہ اس لئے فروع حاصل نہ کر سکا کہ جدیدیت کو فروع دیتے والے رسول نے اشاعت دوبارہ شروع کر دی تھی۔ چنانچہ اچھی نظم کی روشناسی میں جو کمی واقع ہو گئی تھی وہ اچانک بہت سی نسلوں کی اشاعت سے پوری ہو گئی۔

پادی النظر میں نظم اور غزل کی تخلیق میں سچلی اور بالائی منزل کا نکتہ صرف اس بات کا اٹھا رہے ہے کہ نظم میں قریبی اور باریک مشارکہ عشق اور گہرائی پیدا کرتا ہے اور تخلیقی عمل اکٹھافت ذات کا وسیلہ بن جاتا ہے۔ دوسری طرف غزل چونکہ اپنیہ کے رجحانات کی آئینہ دار ہے اس لئے اس میں گردار اپنی الفرادی شخصیت ایک بڑے کل میں مدغم کر دیتا ہے اور فاصلہ ایک عالمگیر عمومیت کو سامنے لاتا ہے۔ چنانچہ جب بیداری اور تحریک کی فضاعام ہر تو غزل تخلیق ہوتی ہے اور جب معاشرہ، موارد و معمول صورت اختیار کر لے تو فردا جماعت سے نظر ہٹا کر اپنی ذات کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور اس زمانے میں بالعموم نظم کو فروع ملتا ہے۔ گزشتہ چند سالوں میں نظم سے غزل کی طرف مراجعت و داصل اس حقیقت کا اعلامیہ تھا کہ معاشرہ انتشار کا شکار ہے اور اگر آپ ۱۹۴۰ء سے پہلے کی معاشرتی اور سماںی صورت حال کو جو بالآخر سقوط ڈھاکہ پر بنتی ہوئی محفوظ رکھیں تو صاف نظر آئے گا کہ اس زمانے کے چیخ دخم اور مدد و جزر کو غزل ہی اپنے دامنِ عافیت میں پناہ دے سکتی تھی۔ اس دور میں نسلیں بھی لکھتی گئیں لیکن یہ نسلیں داخلی کم اور خارجی زیادہ تھیں اور ان کی نوعیت زیادہ تر موضوعاتی

بھتی۔ چنانچہ ان نظموں نے قومی اور ملی جذبات کو خارجی سطح پر بڑی خوبی سے طغیان عمل عطا کیا لیکن وہ کیفیت جو جذبے کی تقلیب کے بعد پیدا ہوتی ہے ظاہر نہ ہوسکی۔ گذشتہ سال نظم میں ایک بار بھروسہ توٹ اور زندگی کی لہریں پیدا ہو گئیں تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اب زندگی میں توازن اور اعتدال کے اثمار ہو یادا ہیں۔ اور شاعر اپنے داخل میں خواصی کر کے اپنی ذات کے گھرے تاثر کو مطلع پر لائے کے لئے صفتِ نظم کے امکانات آزمائے پر آمادہ ہے۔ میں ان معروضات کی روشنی میں گذشتہ سال کی بہترین نظموں کا تجزیہ پیش کرنے کی جارت کرتا ہوں۔

گذشتہ سال کے غالب رجحانات متعین کرنے کی سعی کریں تو سب سے پہلے نئے آدمی کی تلاش ایک غالب رجحان کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ ن۔م راشد نے اس نئے آدمی کی تو چیزیں فلسفی کی سطح پر کی ہے اور بنی آدمی کا نزول لفظ و معنی کے ایک ایسے نکلنے سے تبعیر کیا ہے جس کی حدود کو اولین سطح پر زمانہ قبول نہیں کرتا ہے۔ ایک میں حب پہنچنے مقبولیت اختیار کر لیتا ہے تو اس کے ساتھ زمانہ تعلق قائم کرنے میں تفاخر محسوس کرنے لگتا ہے۔ ن۔م راشد کی نظم "نیا آدمی" نوا اور ساز طرب کو ایک نئے آہنگ میں پیش کرتی ہے۔ فیض کی دلست میں یہ نیا آدمی درحقیقت پہار ہے جو آتی ہے تو اپنے ساتھ عدم سے خواب اور شباب ہمراہ لاتی ہے۔ ان دونوں فیض کے لیے میں نشاطیہ عصر بالخصوص نایاں ہوا ہے۔ چنانچہ ان کے رومانوی انداز میں ملال احوالِ دوستاں کم اور تھار اس غوشِ مہہ و شان زیادہ ہے اور ان کی نظم "بہار آٹی" اس جاں افروز کیفیت کا عمدہ منظر ہے۔

وزیر آفیکی نظم "دست بستہ کھڑا ہوں" اس نئے انسان کو خارج کے بجائے

پانے داخل، میں تلاش کرنے کا مشورہ دیتی ہے۔ "ہوا" جو زمانے کی علامت ہے اس نظم میں ایک الیسی نابینا بھکاری لڑکی کے روپ میں ظاہر ہوئی ہے جو خارج سے اچالے کی بھیک مانگ رہی ہے۔ شاعر نے لاشعوری طور پر نظم کا پیکر کچھ اس طرح مرتب کیا ہے کہ اس سے سریلی ثاثریت جھلکنے لگی ہے۔ چنانچہ زندگی کی دم رد کئے والی کیفیت جسمی فطرت کے داغی تمرنج سے مس کرتی ہے تو زمگوں کی جواہاں پھوٹ نکلتی ہے۔ اور فرد کی ذات اس جواہاں میں کتمان بن کر دکنے لگتی ہے۔ زاہد ڈار کے ہاں یہ انسان ابھی تک ظہور میں نہیں آیا۔ چنانچہ اپنی نظم میں زاہد ڈار نے ان لوگوں کی آواز سننے کا مشورہ دیا ہے جو ابھی اس دنیا میں نہیں آئے۔ اور یوں بالواسطہ طور پر زاہد ڈار نے بھی اندر کے انسان کو اہمیت دینے اور اسے جگا کر قدرت کی سرگوشی سننے کی طرف متوجہ کیا ہے۔

عارف عبدالمتین کی نظم "چراغ کا گھاؤ" میں یہ انسان زمانے کے معنی رو عمل کا شکار ہو چکا ہے اور اپ تمناؤں کے نارسا اور سگندل فرش پر سے پانے صد پارہ احساس کی کرچیاں چُن رہا ہے۔ اس زاویے کی ایک اور عده نظم صنیا جا لندھری کی "سرخ ہوا" ہے۔ اس نظم میں سرخ ہوا انتشار اور تحریک کی علامت ہے اور یہ سورج کا لاداں کر سائیں میں انگارے بھر رہی ہے۔ عرش صدقی کی نظم "اپنی مٹی کی خوبیوں" ان انسانوں میں اعتماد بحال کرتی ہے جنہیں ہم چھوڑ چکے ہیں۔ اس لحاظ سے عرش صدقی نے یہ بتانے کی سعی کی ہے کہ نیا انسان تو دنیا سے رُخصت بھی ہو چکا ہے اور زیادہ حال کا انسان درحقیقت اکھڑا ہوا انسان ہے۔ چنانچہ یہ نظم شاعر کی ایک دلدوڑ کیفیت کو سامنے لاتی ہے۔

ان سب نظموں کی مشترک خوبی یہ ہے کہ ان میں شعراء نے بظاہر اپنا ذاتی  
بھروسہ ہی پیش کیا ہے اور صاف نظر آتا ہے کہ راشد آج بھی اس بغاوت پر آمادہ  
ہے جو اس نے ماوراء کے زمانے میں کی تھی اور پتھر کھائے تھے۔ فیض "داع داع  
اجالا" اور "شب گز یدہ سحر" کے بعد آسودگی کی منزل پر پہنچ چکا ہے، وزیر آف حسب  
معمول داخل میں غتو اصمی کرنے اور عرفانِ حیات حاصل کرنے میں معروف ہے۔ عارف  
عبدالستین قدوں کی شکست و ریخت اور انسان کے گرگٹی انداز پر چیرت زده ہے۔ تاہم  
خوبی کی بات یہ ہے کہ ان شعراء نے ملکی تصورات کو نظر انداز میں کیا اور موجودہ زمانے  
کی روشن پیمائشی میں عملِ خوبصورت انداز میں پیش کر دیا ہے۔ یہ ردِ عمل فیض کے  
ہال رومانویت کے لوحدار انداز میں، وزیر آف حاسکے ہال ماورائی کیفیت میں اور عارف عبد  
اور عرشِ صدیقی کے ہال گھر کی علامت میں ڈھل گیا ہے اور بے حد متأثر کرتا ہے۔

گذشتہ چند سالوں میں بظاہر فطرت سے متاثر ہونے کا رجحان اردو نظم میں  
باخصوص نہایاں ہے۔ گذشتہ سال بھی اس رجحان کی کمی عدمہ نظمیں تخلیق ہوئیں —  
خوشیدر رضوی کی نظم "نیلے پہاڑ" میں فطرت کے ساتھ پیٹنے اور حاضر موجود کا قفل  
تھوڑا ڈالنے کا چذبہ موجود ہے۔ شاذِ تمکنت نے "برفت باری" کے منظر کو اپنی ذات  
پر وارد کیا ہے اور اس آگ کو کریدنے کی کوشش کی ہے جس پر راکھی جم چکی ہے  
ذوالفقار احمد تابش نے صبح کے ایک تلاطم خیر منظر کو فتنی رعنائی سے گرفت میں لیا  
۔ اور اسے پانے والی خلفشار کے اظہار کا دسیلہ پہاڑیا۔ فطرت کے دو منفردزادے یہی  
سمح النصاری کی نظم "دیک" اور ادیب سہیل کی نظم "داع پانی کے" میں بظاہر ہوئے ہیں  
ان دونوں نظموں میں شعراء نے فطرت کے ایک معمولی مشاہدے کو داقعے کی تیلیں

میں پیش کیا ہے اور فطرت کا تحریر یہی زاد یہ ابھارا ہے۔ تاہم خوبی کی بات یہ ہے کہ انہوں نے تحریر سے تعمیر کا قسمی عنصر بھی تلاش کیا ہے۔ چنانچہ سحر القصاری نے یہ سوال اٹھایا کہ تاریجی حرف و قرطاس میں مٹی کے گھر تعمیر کرنے کا فن حرف و تصدیق کے کم معانی کو سامنے لاتا ہے؛ اور ادیب سہیل اس اکشاف پر متمم ہے کہ اسے پانی کے داعوں میں جانے پہچانے چہروں کا عکس نظر آتا ہے۔ ان نظموں کا رچائی انداز بالخصوص متاثر کرتا ہے۔

لمحہ موجود کو اہمیت دینے، اس سے رسنچوڑنے اور الکتاب مسٹر کرنے کا اعلان بھی گز شستہ سال کئی شعرا کے ہاں بالخصوص نمایاں ہوا۔ بشر نواز کی نظم اجنبی سمندر میں یہ لمحہ مسٹر گرفت میں نہیں آتا۔ لہذا زہرناک کیفیت پیدا گرتا ہے۔ دوسری طرف کرشن ادیب نے "رو بیس ہے رخش عمر..." میں ماںی اور حال کے تمام لمحات کو اپنی مسٹی میں لے رکھا ہے اور وہ ان سے قطرہ قطرہ رسنچوڑ کر دزویدہ لذتوں کو سیراب کرتا ہے۔ سرمد صہبائی نے اس لمحے کو مہماں ہو ڈر کی رقصہ (نظم "نایج اے زینگی") کی صورت میں دیکھا ہے اور حجم کے گھنائے ہوئے مہتاب کو زمکنی کے رفق سے زندہ کرنا چاہا ہے۔ ریاضن مجید کی نظم "دائمی رفتاقت کی بشارت" میں لمحے کی سلگستی ہوتی اگر راکھ میں تبدیل ہو چکی ہے لیکن وہ متمم ہے کہ ابھی اس کے سر میں آدازہ شور دشمن گونجا ہے اور اس کے ہاتھ پر ایک روشن زمانے کی آمد مرقوم ہے۔ نارسانی کا یہ فاصلہ انور محمود خالد کی نظم "وس دن پہلے" میں بھی موجود ہے اور اس کے ہاں فطرت ایک خیال انگیز و خشت بن کر مہک آلو درپوائی میں کیسہ روپ جاتی ہے۔ ناہید قاسمی کی نظم "خانہ بدوش" لمحے کی معصوم مسٹر کو اجاگر کرتی ہے۔ اس نظم کا موضوع اگرچہ طبقاتی

تضاد ہے لیکن شاعر نے موضوع کو بڑی خوبی سے تخلیق کی زیر یہ سطح سے ابھرنے  
نہیں دیا اور فطرت کے اس زادی پر کو ابھارا ہے جو امیر اور غریب دونوں میں مشترک  
ہے۔ پر وین شاگر لمحے سے خالص نسائیِ مسٹر اکتاب کرنے کی آرزو مند ہے اور  
زندگی کی "بائیوگرافی" پر ایسی برسات کی منتظر ہے جو اس کی مرگ بجاں روح  
کو حیاتِ نو دے دے۔ آذرتنا کی نظم "زندہ رہنے کی کوشش" میں لمحہ ایک نہ  
حقیقت بن گیا ہے اور وہ مسٹر اکتاب کے اس لمحے میں جیسے ساری دنیا کی سرخوشیاں  
سمیٹ چکا ہے۔ ظفر سلطان نے نظم "راہباؤں کے نام" میں زندگی سے فرار کو غیر  
فطری قرار دیا ہے اور لکھباؤں کو بالواسطہ طور پر مشورہ دیا ہے کہ وہ زندگی کی حقیقتی  
لumentos سے گہریاں نہ ہوں۔ اس نظم کا اظہار مستقیم گھر تاشر بالواسطہ ہے۔

گزشتہ سال دوستوں کو مناطب کر کے نظمیں کہنے کا ایک نیا رجحان بھی سامنے آیا ہے۔  
اس سلسلے کی نظمیں میں اولین سطح پر وہ لوگ سامنے آئے ہیں جنہوں نے دوست کو اپنی ذا  
کا جزو بنانے کے بجائے اسے منافقت کے خیز سے ہلاک کرنے کی کوشش کی چاہئے  
اس کا ایک روپ تو اعجاز فاروقی کی نظم "داستاں در داستاں" میں ناگن کی صورت میں ظاہر  
ہوا اور یہ ناگن نور کے درپا پر جھیٹ کر نیلے اور سبز اور پیلے زنگوں کو چلتے میں مصروف  
ہے۔ بیلم الرحمن نے اپنی یہے عنوان نظم میں اس ناگن کو تباہ چہروں کی تحرید میں مشاہدہ کیا  
ہے۔ اس رجحان کا نسبتاً واضح روپ اظہر جاوید کی نظم "منافق دوستوں کے لئے ایک نظم"  
میں مستقیم انداز میں ابھرا ہے اور یہاں شاعر دوست کے ہاتھوں سنگار ہی نہیں ہوا بلکہ  
اب وہ صلیب کا نہ سے پر اٹھائے ان زخموں کی عبادت بھی کر رہا ہے۔ احمد اسلام احمد  
کی نظم "گلہ" میں یہ تاثر بنتا پھیل گیا ہے۔ تاہم اسکے زیر لب دھیمے ہجئے نے درد کی ایک

خاص کیفیت کو جنم دیا ہے اور یہی اس نظم کی خوبی ہے۔ اصغر ندیم سید نے "اپنی مت پر ایک نظم میں خارجہ زندگی کی منافتوں کو اجاگر کیا ہے۔ شکایتوں کی اس فضائیں ایک خوشگوار تاثر سہیل احمد نے پیدا کیا ہے اور یہ متذکرہ رجمان کا نبیشاد وشن زاویہ ہے۔ سہیل احمد کے ہاں اڑتا پرندہ وقت کی علامت ہے۔ اور یہ کونج کی مثال میں ہجڑوں کی داستانیں ساتا ہے۔ سہیل احمد کی نظم "ایک موسم کے دوستوں کے لئے ... " میں محبت کا عالمگیر جذبہ اپھرتا ہے اور وہ دوست سامنے آتے ہیں جن کے ساتھ شاعر نے محبت کی بہاریں گزاری ہیں اور اب یہ بیتے دن تالاب کے پانیوں پر چھڑا چھڑا ہے۔ ہیں تو شاعران مترتوں کی تجدید کے لئے مفہومیں

رجمانات کے متذکرہ دائروں سے ہٹ کر نظر وڑا میں تو برا جہول کی نظم سمجھا اور ایک ایسی قابل تدبیہ تخلیق ہے جو شاعر کے نکری ارتقاء کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ برا جہول نے بھارت پسنداروں کی زاجی کیفیت کو پانے داخل کے وحشی سے ہم آہنگ کیا ہے۔ اور یوں مل کے سوئے ہوئے سناؤں کو جلانے کی کوشش کی ہے۔ قبیم کا مشیری کی نظم، "جنم کے اندر جنم کے باہر" اس انسان کا ذمہ ہے جس کے جنم پر اندر جسی چھیزوں نے یلغار کمر زخمی ہے اور خوف کا شیخھا لشکارا جس کے بدن کو کاٹ رہا ہے۔ صبح کی دُغا میں سردار مرنا نے ماں کی تقدیس کا ایک پُر غلطت نزاویہ ابھارا ہے۔ حامد جیلانی نے نظم کوئی دودے بن جاتا ہے وجد" میں دودے سے وجد کو جنم دیا ہے اور پھر اس وجود کی لذت میں پناہ تلاش کی ہے۔ سمجھادیا برلنے نظر سامنا، میں خارج کی غفوٰ نت سے آنکھ پند کرنے کے بجائے یہ غفوٰ نت درسوں کو دکھانے کی کوشش کی ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ گزشتہ سال زیادہ طویل اور بے حد مختصر نظم لکھنے کا رجمان کچھ

زیادہ مقبول نہ ہو سکا۔ طویل نظم کی فارم کو ن۔م۔ راشد اور مختار صدیقی بالخصوص کا میاپی سے استعمال کرچکے ہیں۔ ان کے بعد مراتب اختر اور سرمه صہبائی نے طویل نظم میں جذبے کی اکافی کو قائم رکھنے کی سعی کی۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ شعرا دریڈیو۔ ٹی۔ دی اور انجارات کے لئے لکھنے میں اس قدر مصروف ہیں کہ غالباً تخلیقی نظم کے لئے عرفان کا طویل وقفہ متینر نہیں آ سکا اور یوں طویل نظم کی کوئی کامیاب تخلیق سامنے نہ آ سکی۔

گزشہ سال کے دوران میں یہ بات بھی بالخصوص واضح ہوئی کہ ثقہ شعرا کے شانہ پشاہ نسبتاً نوادر شعرا نے بھی کامیاب نظمیں کہیں اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اردو نظم میں نئے خون کی جوڑے روای شامل ہو رہی ہے اور اس کے مستقبل سے مایوسی کی کوئی وجہ نظر نہیں آئی۔ بدشیر شعرا نے داخل کی پر اسرار سگوشی کو سننے اور اس وجدانی کیفیت کو اپری ساحری سے گرفت میں لینے کی کوشش کی۔ چنانچہ ہے کی گھن گرج، اضنا فتوں کا تحرک عربی اور فارسی کے لقیل الفاظ کا استعمال فراواں بڑی حد تک کم ہو گیا اور ان کی جگہ شعرا نے پستہ وطن کی سرزین کو اہمیت دی اور ایسی حلامیں اور تشبیہیں تخلیق کیں جو زندگی کے علاوہ موجود چیزوں کی اہمیت واضح کرتی تھیں اور قاری کو ان میں غرائب محسوس نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ بدشیر وہ شعرا بھی چن کے نزدیک شاعری عقیدے کے واضح اظہار کے بغیر بے مقصد ہو کر رہ جاتی ہے اور وہ سانتے کے مشاہدے کو فرمی طور پر الفاظ کا جامہ پہناتے میں تعجب کرتے ہیں۔

گزشہ سال داخل تجربے اور اکشاف ذات کے عمل سے گردے اور پے حد خواہ صورت نظمیں تخلیق کیں۔ چنانچہ یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ ایک عضوں ترقی پسند سانچے کی نظموں کے مقابلے میں شاعری کا وجدانی زادیہ زیادہ مقبول ہوا۔

شاعری کے مسائل کے سلسلے میں "نشری نظم" کے مسئلے نے گزشتہ سال خاصی گرد اڑائی۔ کچھ عرصہ قبل چند ناراض نوجوانوں نے نئی سانی تہیلات کا شاخانہ کھڑا کیا تھا لیکن جب عوام کی طرف سے اسے پذیرائی نہ مل سکی تو یہ نوجوان اپنی لفکشی کا سامنا بھی نہ کر سکے اور اپنی صدائے بازگشت میں ہی گم ہو گئے۔ "نشری نظم" کا شاخانہ بھی چند اپنے سہی انہمار نوجوانوں کی اختراع ہے جو ابھی تک فن کی مبتدیات سطح سے تو بلند نہیں ہو سکے لیکن تخلیقِ فن کے ساتھ داستانگی کے آرزو مند صدر ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا اور محمد علی صدیقی نے اس ناچحت تجربے پر فتنی نوعیت کے اعتراض اٹھائے ہیں اور نوجوان شد اکو مشورہ دیا ہے کہ وہ فن کے لئے جس تخلیقی ریاض کی حصر درت ہوتی ہے اسے پورا کرنے کی سعی کریں۔ اول الذکر موقوفت یہ بھی ہے کہ اس قسم کا تجربہ رباع صدی قبل "نیرنگِ خیال" کی بساط پر کیا جا چکا ہے لیکن اسے کا سیاہی حاصل نہ ہو سکی چنانچہ ڈاکٹر وزیر آغا نے ایسی تخلیقات کے لئے جن میں نشر کی ہمیست اور نظم کی جنسیں پرداز کا امتزاج ہو "نشر لطیف" کا نام تجویز کیا اور اب یہ نام اتنی مقبولیت حاصل کر گیا ہے کہ ادب اس صفت کے تحت ہر صفت سخن میں وجدانی نظر لطیف تخلیق کر رہے ہیں۔

تو یہ بھتا ۱۹۴۵ء کی نظم کا ایک مختصر ساختہ!

اردو نظموں کے بہترین انتخاب ثالث کرنے کی روایت اب نئی نہیں رہی، مکتبہ اردو زبان اس سے قبل ادب کے دو انتخاب پیش کر چکا ہے اور انہیں اہل ادب نے حبِ توقع نپریائی عطا کی۔ اب کے سال یہ انتخاب صرف بہترین نظموں تک محدود رہ گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اشاعتِ کتب کا کام اب آٹا مہنگا ہو گیا۔

ہے کہ تنازع شامل نہ کرنے کے باوجود نکلتبہ اردو زبان کی بساط سے اخراجات تجاوز کر سکے ہیں۔ اس لئے ہم اس انتخاب میں صرف نظمیں شامل کر رہے ہیں۔

زیرِ نظر انتخاب میں کراچی، لاہور، برس کوہاڑا اولینڈی، پشاور، پنجاب اہل قلم شرکیب ہوتے۔

شاعر کے نام صیغہ راز میں رکھے گئے اور منصوبیں سے استدعا کی گئی کہ وہ بہترین نظمیں کو نشان نہ کر دیں۔ میں نے ان آراء کی روشنی میں بہترین نظمیں کو صرف مرتب کرنے کی سعی کی ہے۔ اس کتاب پر چونکہ منصوبیں کے نام شائع نہیں ہو رہے اس لئے انتخاب کی تمام ذمہ داری کو میں قبول کرتا ہوں اور ان شعرا سے جن کی شاندار نظمیں اس انتخاب میں شامل نہیں ہو سکیں مفردت خواہ ہوں۔ نئے شعرا کی ایک بڑی تعداد کی شرکت اس حقیقت کی غما نہ ہے کہ انتخاب میں بڑے نام کے بجائے بڑائی نظم کو اہمیت دی گئی ہے۔ اور اس معیار کو آئینہ بھی قائم رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ مجھے اس بات کا اظہار بھی کرنا ہے کہ بعض شعرا کی دو یا دو سے زیادہ نظمیں منتخب ہوئیں لیکن مجازہ اصول کو قائم رکھنے کے لئے صرف ایک نظم ہی شرکیب اشاعت کی گئی ہے۔ زیرِ نظر انتخاب صرف پاکستان کے ادبی پروپریتی سے مادر ہے۔ اس لئے اس میں صرف رہی مہدوستانی شعرا شرکیب ہیں جن کی نظمیں کی اشاعت پر کے رسائل میں ہوتی۔

آخر میں مجھے ان سب شعرا اور ادبی رسائل کے مدیران کا شکریہ ادا کرنا ہے جن کے تعاون سے یہ مجموعہ مرتب ہوا۔ آئینہ سال کا انتخاب ابھی سے زیرِ حمل ہے اور پاکستان کے پانچ اہم شہروں میں حسب سابق بہترین نظمیں کو منتخب کرنے کی سعی ہو رہی ہے۔

ن۔ م راشد

## نیا آدمی

لوا اور سازِ طرب

یہ سازِ طرب میں نوائے تنا  
 نوائے تنا پہ کوچے کے رٹکوں کے پتھر  
 یہ پتھر کی بارش پہ سازِ طرب کا سردا!  
 نئی آگ، دل

دلِ ناتوال کی نئی آگ سب کا سردا!

نئی آگ سب سے مقدس ہمیں

اسے آج کس کس کی آنکھوں کے معبد پہ جا کر حضرتھا ہیں؟

نئی آگ کے کس کو معنی سمجھا ہیں؟

نئی آگ ہر پشم و لب کا سرور

نئی آگ سب کا سرور

روایت، چاڑھ۔

خدا پانے سورج کی چھتری کے نیچے کھڑا  
نالہ کرتا ہوا!

چاڑھے کے ہمراہ چلتے ہوئے  
گھر کے بے کار لوگوں کے شور و شغب کا سرور!

نئے آدمی کا نزول۔

اور اس پر غضب کا سرور  
دنئے آدمی کی اس آمد سے پہلے  
مہینوں کے مجوکے کئی بھیرلوں کی فغاں  
— زمانے کی بارش میں بھیگے ہوئے بھیرئے۔

نئے لفظ دمعنی کی بڑھتی ہوئی یک دلی  
اور اس پر برا نئے نجیرلوں کی فغاں

## فغاں کا غصب اور غصب کا سرور!

نئے آدمی کا ادب۔

ادب اور نیا آدمی

نئے آدمی کی طلب کا سرور

نئے آدمی کے گماں بھی لیتیں

گماں جن کا پایاں نہیں

گماںوں میں والش ببرہنہ درختوں میں باوٹیم  
ببرہنہ درختوں کے دل چپرتی!

نئے آدمی کا ادب

اور نئے آدمی کو ادب کا سرور

(نیا دور)

فیض حسین فیض

## بہار آئی

بہار آئی تو جیسے بک بار  
 لوت آئے ہیں پھر عدم سے  
 وہ خراب سارے، شباب سارے  
 جو تیرے ہونٹوں پہ مر مٹے ہیں  
 جو مر کے ہر بار پھر جئے ہیں  
 نکھر گئے ہیں گلاب سارے  
 جو تیرنی یادوں سے مشک بو ہیں  
 جو تیرے عشق کا لمبھو ہیں  
 اُبل پڑے ہیں عذاب سارے  
 جو پند آمکھوں میں کھو گئے مختے

جو سرد نبضوں میں سور ہے نئے  
 ملالِ احوالِ دوستاں بھی  
 خمارِ آغوشِ مہ و شاہ بھی  
 غبارِ خاطر کے پاب سارے  
 ترے ہمارے سوال سارے  
 جواب سارے  
 پہار آئی تو کھل گئے ہیں  
 نئے سرے سے حباب سارے

(پاکستانی ادب)

# سرخ ہوا

سرخ ہوا تصور کہ جس میں شہر اور سبی ایندھن

سرخ ہوا سورج کالاوا جس کا لمبادا من

کہ ساروں کا لہو لہان کفن

سرخ ہوا شاخوں سے چھپنے کی انگاروں کی سلگن

یہ انگارے حلنتی بھتی سانسوں میں لبس جاتے ہیں

سرخ ہوا کے ہر چبوٹکے پر

کتنے پتے چھڑ جاتے ہیں

سرخ ہوا کی ہر جنیش پر

کتنے خراب اُبرٹ جاتے ہیں

سرخ ہوا کی آنچ میں سکتنے کو مل جم جلس جاتے ہیں

پریڑ ہیں یا پر چھائیاں، ان کی شاخیں ہیں یا سائے ہیں  
 اب جو کالی رواییں پہنئے  
 دُھنڈ لے دیئے ہاٹھوں ہیں لئے  
 بے عکس آئینوں میں پانے چہرے ڈھونڈنے آئے ہیں  
 لیکن یہ آئیئے کالے، آنکھوں کو ڈس جاتے ہیں

(نیا دور)

ڈاکٹر ورپرائعن

## دست بستہ کھڑا ہوں

ہوا — ایک نابینا لڑکی ہے  
 انکھوں کے بچکل میں ہاتھوں سے رستہ پنا تے ہوئے چل رہی ہے  
 کوئی اُس کے کشکوں میں میلا چاندی کا سکتہ گراتے  
 جلی خشک روٹی کا ٹکڑا ایسا کاغذ کا پُرزا اُس سے دان دے تو — ہوا  
 پسے محسن کو مدھیھی سی کومل دُعا دے کے آگے کو پڑھتی ہے  
 اندر ہیوں میں لپٹی ہوئی منزل بے نشان کی طرف  
 آسمان کی طرف

ازل سے میں اس انہی لڑکی کے پیچے

زمین پر گرے بھیک کے نزد گھر والوں پہ پلما رہا ہوں  
 کسی منزل بے لشائ کی طرف سُست قدموں سے چلما رہا ہوں  
 مگر اب مجھے اس سفر سے  
 چمکتی ہوئی سُرخ راکھی کے بندھن سے  
 اندر ھمی ہوا کے چلن سے  
 کسی سے بھی رغبت نہیں ہے!  
 چلو (تجوہ سے کہتا ہوں) اس اندر ھمی لڑکی کا اب ساتھ چھوڑیں  
 شب درد کے دائے سے نکل کر  
 ذرا اپنی جانب بھی رُخ اپنا موڑیں،

میں اپنی طرف مُرڑ گیا ہوں  
 مگر دیکھتا ہوں:  
 میں خود اپنے رستے میں اک سبز جنگل کی صورت کھڑا ہوں  
 ہزاروں تنوں، ان گنت شاخاروں، کروڑوں سییہ چھاڑیوں سے  
 آٹا ہوں  
 میں ان سازی گپٹ نڈلیوں کو

جو سیری طرف بے تھا شہ اُمڈنے لگی تھیں  
بڑے شوق سے کھارا ہوں

میں اپ تیرہ جنگل کی ٹیڑھی سیدہ انگلیوں  
سانپ ایسی مُرطھی ٹھینپوں میں اُترنے لگا ہوں  
اندھیرے کی دنیا میں مشعل کی صورت بڑھا ہوں  
تراشیدہ رستے تو جنگل کے پاہر کہیں رہ گئے ہیں  
گھنے مُند جنگل کے اندر میں خود اپنارستہ بنا ہوں

نجب روشنی بے  
اندھیرے کے کشمکش میں کس نے پھینکا یہ سونے کا دینار؟  
جس سے شعاعوں کی کلیاں نکلنے لگیں  
سارے جنگل کے پتے زمرد بنئے، ٹھیاں پیلے سونے کی  
چھڑیاں ہوئیں

چھڑیوں میں دہکنے لگے رُخ پھولوں کے فالوس  
سات زنگوں کی پیاں ان کھاساک رقص کرنے لگیں

اوہ پھر  
میں نے دیکھا کہ میں پانے ہی روپ و دست بستہ کھڑا ہوں  
میں تاریک جنگل، خود پانے ہی پر تو سے اندرھا ہوا ہوں

(افکار)

## چراغ کا گھاؤ

سری روح کے سنگریزوں کو کس نے چنا ہے،  
 ہر اک شخص میرے لہو سے اُبھرتی ہوتی روشنی کے نہارے  
 تھنڈوں کے نارسا، سنگدل فرش سے،  
 خود پتھے ہی صدر پارہ احساس کی کرچیاں چُن رہا ہے،  
 میں کس سے کہوں اور کیسے کہوں،  
 کہ میں پانے قدموں سے پلتے ہوئے اُس انڈھیرے سے  
 جنگ آگیا ہوں،

جو میرے ہی پیکر کی بے رحم تخلیق ہے!

بجا ہے کہ میں شب کے آغاز سے جل رہا ہوں،

اور اس شب کے انجمام تک جلتے رہنے کی خواہش کا بھی ترجمہ ہوں،  
 میں اپنے لہو کا بلیدان دینے کو تیار ہوں صبحہم تک  
 مگر وہ سحر جس کی امید پر میں نے اپنے ہی شعلے سے پھکنا  
 گوارا کیا، رُوح کی خنکیوں سے کنارا کیا  
 اس کی آمد کا تابندہ لمحہ

تصوّر کی موہوم حد سے بھی باہر نکلتا چلا جا رہا ہے،  
 ادھر میرے پانے لہو کا ذخیرہ بھی معصوم ہونے کو ہے،  
 ادھر باد صرصر کے منہ زور جھونکے بھی میری سمُّتی ہوئی تو پہلی فار  
 کرنے کو ہیں!

میں خود پانے قدموں سے لپٹے اندر میرے کو مانا کہ کیس فراموش کر دوں،  
 مگر کس طرح سے میں اس خوں چکاں تیرگی کو بھلا دوں،  
 جو اُن غم کے مار دیں کونا گن کے مانند ڈسنے کو ہے،  
 جنہیں اپنے صد پارہ احس کی کرچیاں چھنتے چھنتے زوال آ رہا ہے  
 میں کیسے کہوں، کس طرح سے کہوں، کس قیامت کا مجھ کو  
 خیال آز رہا ہے!

# پھر راؤ

آوازیں، تصویریں، پچھرے کے لوگوں کی  
خوابوں کے دھنڈے درپن میں  
اپ پچکے چکے ہنستی ہیں، میں روتا ہوں،  
لیکن میں بھی کب روتا ہوں  
سب رسماں ہمہ نئے روٹے کی، ورثے ہیں پائی ہیں میں نے  
دل کی سب یاتیں دل میں ہیں  
آنکھوں اور ہونٹوں پر آنے والے سب منتظر جھوٹے ہیں  
سب پر دے ہیں جو حائل ہیں  
میرے اندر کے دھشی اور پاہر کے روشن شہری میں

کچھ لڑکے رات کو آتے ہیں  
 بہتر اشغال سے فارغ ہیں  
 گالی، دشنا م، زیاں سوزی کی لذت سے  
 شب کا نشاٹا بھرتے ہیں  
 میں شہری ہوں، باعترت روشن شہری ہوں  
 میرے اندر کا دشمنی مجھ سے کہتا ہے  
 یہ لڑکے تیرے ساختی ہیں  
 یہ سارے بندھن جھوٹے ہیں، یہ سارے پردے فاضل ہیں  
 گالی، دشنا م، زیاں سوزی کی لذت سے  
 دل کے سناٹوں کو بھر لے  
 کچھ سپھر لے اب ہاتھوں میں  
 کر پھراو اس کوچے پر وہ آنگن ہے  
 جس کی منٹی میں تیرے سب خوابوں کا مدفن ہے

(اوراق)

## شاذ تملکت

### بِرْفَ بَارِي

زماں کی رُت، نیم شب، برف باری  
 بہ حسدِ نظر بھر بھرائی ہوئی لو،  
 فضاۓ دل و جاں کی شیون گزاری  
 درختاں رفتہ ہواں کی زد پر  
 خزاں دیدہ پتے سکتے ہوئے سے  
 بھٹھر قی ہوئی حپاندھی، کانپتی صتو  
 دریچوں کے شیشے درکتے ہوئے سے  
 کوئی پیخ، آواز، جھنکار، نغمہ  
 روانی خون گلو مقصہ رہی ہے  
 کریدو! انگیجھی کا سینہ کریدو  
 مری آگ پر راکھ سی جم رہی ہے

(الفاظ)

## اپنی ہستی کی خوشبو

میں جب لسٹی کی سرحد پر کھڑا ہو کر اُفق کی ڈوبتی راہوں کو تکتا تھا  
تو وہ رورے کے کہتی تھی

مجھے ڈر ہے، تجھے یہ ناترس راہیں نہ کروالیں جداجھو سے  
میں اپنی انگلیوں سے اس کے آنسو لوچھے کر کہتا تھا، اب کیسا جدرا ہونا  
مگر میں دل میں ڈرتا تھا کہ ان راہوں سے واقف تھا  
اُنہی راہوں پہ پل کرائیں دیارِ غیر میں آیا تھا اور یہ سوچ بیٹھا تھا  
کہ یہ میرے سفر کی آخری منزد ہے، یہ المعام ہے میرا

مگر سہردم  
اُفق میں ڈوبتی راہیں،  
گزرتے باولوں کی روشنائی سے

ہوا میں کچھ پرانی بستیوں کے نام لکھتی تھیں  
 اُسے اک روز میں نے کہہ دیا، مجھ کو میرے احدا و کاہدن بلاتا ہے  
 میری جاں مجھ کو جانا ہے  
 مگر تمھری نہ جاؤں گا  
 وہ اک بُت کی طرح دسر کو جھکائے) چپ رہی لکین  
 خوشی کو زبان کہیئے تو سب کچھ کہہ گئی مجھ سے!  
 جو آنسو اس کی ملکیوں سے گئے تھے شک میٹی پر  
 انہیں میں نے تڑپتے، سوچتے اور بو لتے دیکھا  
 پھر اس شب اس کے پہلو سے میں اُٹھا اور افق میں  
 ڈوبتی راہوں پہنچتا پاتے آباد کی اُسی  
 مہنگی کی خوشبو کے تعاقب میں چلا آیا جو  
 میرے خون میں پہنچتی تھی!  
 مجھے پہلو سے گم پاکز وہ نہ اپنے زبان لڑکی مگر کیا سوچتی ہوگی !!

(اوراق)

## داستان در داستان

(۱)

نور کا در برا بہما  
 گر رات کی گلی سیاہی میرے چہرے سے دھلی  
 پھیلتی قوس فرج  
 پھر آسمانوں سے اتر کر  
 میری آنکھوں کے دریچے سے گزرا کر  
 کالی دھرتی کے سیاہ گلے بدن میں لیوں سمونی  
 جیسے سورج چاند کو روشن کرے  
 بے محابا زنگ پھوٹے  
 اورے نئے سینز پیٹے  
 اور ان زنگوں سے مسیقی کے دھارے

میرے کالوں میں ہے

زنگ اور آواز

چشم و گوش

ہر سو لور کا ک رقص

میری روح کی پہنائیوں میں ایک نغموں کا سردش  
اور میرے پاؤں کی گلی سیہ مسٹی میں رنگوں کا خردش

رقص

میرے جسم کے ہر انگ میں کرنوں کے تپر

جسم کی ساری رکیں روشن ہو میں

خون

جو اندھی رہوں میں کھولتا پھرتا تھا

اب تھا پر سکوں

جسم کی اندھی رہوں میں

رقص تھا

کرنوں کا رقص !

(۲)

اور پھر آئی دہی ناگن

دہی زلف دراز

نور کے دریا پہ جھپٹی

اپنی زلفوں کی سیاہی اس میں گھولی

اوہ میں نیلے سبز پلے زنگ چائے

ہر طرف پانے لہو کی شورخ سُرخی کو بکھیرا

ڈس گئی

تو خون پھر انندھی رہوں میں کھولتا پھرنے لگا

جسم پھر گیلی سیاہ مٹی سے آلو دہ ہوا

(۳)

پھر کہیں سے اک سر بلی مدھ بھری آواز

میرے کان میں اُتری

کسی کی بیجی آنکھوں کے روزان میرے ہی تارِ نظر پر واہوئے

رفق - آوازوں کا رفق

آنکھ کی سُتھی کا رقص

پھول جیسے ہونٹ میرے رُخ سے پیوستہ ہوئے  
میرا پدن توں قرح میں ڈھل گیا

رُنگ اور آواز

چشم و گوش

اس کے ہونٹ اور میری دُعا

(۲)

رقص میں بھتی کائنات

دائرہ در دائرہ

چھپیتا بڑھتا ہوا

کہکشاں، سورج، ستارے، چاند، ستیارے، زمین

ایک گردش میں اسیر

تیرگی اور روشنی کے دارے بنتے ہوئے

اور یکاک چاند دو طحیطے ہوا

پھر وہ سورہ آفتاب

اور یہ تی ریت کی لہریں  
 کہیں افتاب کہیں خیزال  
 زمیں جیسے غبارِ راہ بن کر اڑ رہی بھتی  
 میرے سر پر لوز کی کملی کا ٹھنڈا سامبان  
 جنم کا جادو ہوا باطل  
 پیرے ہونٹوں میں جو الفاظ سچھرتے  
 وہ حاگ اُٹھتے  
 وہ "کن" جو جنم کے پروں میں محو خواب تھا  
 زندہ ہوا  
 تو کہکشاں، سورج، ستارے، چاند، ستارے  
 میرے اندر سے نکلے  
 ایک گردش میں اسیرا

(اوراق)

محمد سلمان الرحمن

## نظم

سیاہ راتوں کے بے امال راستوں پر چلیے ہوئے یہ چہرے  
 کہ چلیے پت چھڑ میں نزدیکی بکھر گئے ہوں  
 بس ان کی لیے پین زخم خور دہ سی پیسوں میں رہتی ہے باقی  
 یو گھومتی ہیں جو منتظر ہیں۔

مرے زمانے میں پھل نہیں ہیں، فقط خراں کے  
 زداں ہیں اور ایسے طوفاں کہ پاد اور روشنی کے اوپنے  
 درخت جڑ سے اکھڑ گئے ہیں۔ امیدنا آشنا دلوں میں  
 جو درد ہے راز بن چکا ہے، جو لفظ ہیں وہ اُجڑ رہے ہیں

مجھے اپنی خرال میں جو چیز یاد ہے وہ ہر ایک رستے  
پاؤں گنت پتکیوں کی گردش کا کرب جیسے  
ہزار ہا موم بیٹیاں جو مرے بدن اور میری آنکھوں  
کو چھو کے جھبٹتی ہوں اور اندر ہیرے کو میرے اندر اتارتی ہوں

یہ سپلیاں جن میں گھوٹتے اور ڈوبتے ہیں سمجھی ستارے  
یہ آسمانوں کو تکنے والے تباہ چہرے،  
تمام تحریر کے مُر قتوں میں صفت پہ صفت منتظر ہیں مینہ کے  
بڑاں کی پامالیوں کو دھوکر سفید کر دے

جلے نجھے اور خام زنگوں کی گنجائک سے جگہ جگہ شق  
یہ مرگِ ابنوہ جس کی تہ میں دبی ہوئی آگ کی حرارت  
ہے آخری فصلوں کا موسم کہ آپنہ دار ہیں یہاں پہ  
خود پانے چہرے کو ڈھوندتا پھر رہا ہوں شاید پا کھو چکا ہوں،

## اجنبی سمند

پھر کسی انجانے جھوٹھنکے نے ہمیں  
 بیکاراں کالے سمندر کے حوالے کر دیا  
 کہ اڑاتی چھپتی سیال دلیواروں کے بیچ  
 کر دیا مخصوص رہن دھم کو کچھ اس طرح  
 اپنی مرضی سے ذرا جذب ش بھی کر سکتے نہیں  
 مونج سے جب مونج لکھراتی ہے، پل بھر کے لئے  
 آزاد ہو جاتے ہیں ہم

اپنی آزادی کی عمر  
 ایک سے

دوسرा

اور دوسرے سے تیسرا نداں بدل لینے کی مہلت پر محیط

اور ہم

اپنی اپنی سوچ سے پیٹے ہوئے

خوشنما منظر، انوکھے دائیں

نہ نئے پیکر خلاؤں میں بنائے بہہ رہے ہیں چار سو

چاند تاروں، اڑنے والے طاڑوں کے عکس کے

بھیجھے پیچھے دورتے ہیں اپنی دلپواروں کے ساتھ

اور جب بھیاتفاق

کچھ گریزیں عکس پرال ڈال دیتا ہے ہماری گود میں

ان کو اپنی کوشش پہم کا ثمرہ فرض کر لیتے ہیں ہم

لے سمجھ دrajنی

اس گرفتاری کی مجبوری کی ساری عمر پیں

ایک لمحہ تو بتا

جو ہمارے اور ہمارے ہی تھرت میں رہا

ایک تر لمحہ بتا

اپنی مرضی سے جسے ہھڑا سکے  
 اپنا سب کچھ لارکے بھی جس کو ہم لوٹا سکے  
 کم سے کم دل کھول کر جس کو کبھی اپنا سکے

(اوراق)

کرشن ادیب

رُو دل میں ہے رُششِ عمر.....!

چلو آج ہم موڑ دیں عمر کے تیز رُو خش کو  
اسی ایک ستمتِ مخالفت کی جا ش

بچہاں آج بھی میریا

شام ہوتے ہی نیلے سمندر کی کھاری ہواں میں لہٹی ہوئی  
پئے ہاتھوں میں بھر کر مٹے خانہ ساز  
کسی آنے والے مسافر کی تنشہ لمبی کے تقاضوں کو سیراب کرنے کی ہے منتظر!

چلو شب کے پذیراں اڈوں پہ چاہیں ذرا

کہ شاید ہمیں یاد کرتی ہوں وہ بدھپن لڑکیاں

— جن کے جسموں کی قربت میں ہم نے گزاری تھیں راتیں کئی!

چلو آج ان سے ثاب پر گذشتہ کی پایتیں کریں!  
کسی ایک ذر دیدہ لذت میں ڈبے ہوئے ہے تکلف لطیف نہیں!

اور عمر گریزاں کے احساس کو بھول کر...  
— ایک لمحے کو چھرے سے سنجیدگی کی تہیں کھڑج دیں!

سمجھی چانتے ہیں  
سمجھی مانتے ہیں

کہ عمر گریزاں سماحت سے محروم ہے!  
پھر بھی عمر گریزاں کو آواز دنے کر بلائیں فدا  
وگرنہ کسی روز پتیر رونخش بھی  
کہیں دور فردا کے عنم ناک صحراء میں بھٹکا ہوا،  
ٹھنک کے رہ جائے گا  
— اجلنی رہ گزاروں پر ہر جائے گا!

ادیب سہیل

## دائع پانی کے

مری چھت اک مصوڑ ہے  
میرے کمرے کی دلواروں پر رس رس کر  
برستے ابر سے اس نے کئی چہرے بنائے ہیں

مرے گھروالے کہتے ہیں  
مرمت چھت کی جب کرتے چلے  
دلوار کی چوناکلی بھی ساٹھ کروادو  
— کہ یہ پھیلے ہوئے سے دائع پانی کے  
مہلت پذیر یہ لگتے ہیں  
انہیں کیسے بتاؤں دائع پانی کے

میرے گرے کی زنیت ہیں  
 یہ سب صورت ہی صورت ہیں  
 یہ سب جلوے ہی جلوے ہیں  
 مجھے ان میں کسی چانے ہوئے چہرے کا روشن عکس ملتا ہے

(ادرات)

زاہر دار

## نظم

اور ان لوگوں کی آواز سنو  
 جو ابھی دنیا میں آئے ہی نہیں  
 زندگی اونچے پہاڑوں سے اُترائی ہے  
 شہر میں ان کے سواغت کے لئے  
 دھوپ نے آگ لگا رکھی ہے  
 اور تہائی میں جلتے ہوئے ارمانوں کی  
 راکھ کو وقت نے دھوڈالا ہے  
 اب ہمارے لئے امید نہیں  
 اب ہمارے لئے آرام نہیں  
 موت گودوڑ ہے لیکن پھر بھی

چار سو شہر میں خاموشی ہے  
 اور ہم ان کے لئے  
 جن کو آنا ہے ابھی دنیا میں  
 شہر کو چھوڑ کے اب جاتے ہیں  
 سیز، تاریک، گھنے جنگل میں  
 پارشیں، تیز ہوا میں، خوشبو  
 اور ان لوگوں کی آواز سنو  
 پرف اور ریت پر قدموں کے نشان  
 چانے والوں کے نظر آتے ہیں  
 آتے والوں کے نہیں  
 آتے والوں کی خبر صرف ہوا لاتی ہے  
 نرم، خاموش، اداسی کا پدن  
 جیسے خوالوں میں کسی عورت کا  
 جنم سائے کی طرح پھرتا ہے  
 اور سب خوف بکھر جاتے ہیں

اس کے جادو کا اثر ایسا ہے  
 کہ ہر اک چیز سے ٹکرائے کی  
 ٹوٹ جانے کی فنا ہونے کی  
 ارز و دل میں جنم لیتی ہے  
 ایسے آتی ہے وہ آڑا جسے  
 سُن کے احساس یہ ہوتا ہے کہ اب دنیا میں  
 چند روز اور ٹھہرنا ہے میں  
 اگلی منزل ہے کہاں؟  
 چاند پر؛ یا کسی سیارے میں  
 جو ہواں کی گزر گاہ نہیں  
 جس میں خوشبو ہے نزگ  
 جس میں خوشیاں بھی نہیں، دکھ بھی نہیں  
 اور اس سروچ کے آزار سے آزادی ہے  
 کہ ہم اس دنیا میں کیوں آئے ہیں  
 کہ یہاں آنے کا کیا حاصل ہے

اور جانا ہے کہاں؟  
 ایسے لگتا ہے کہ ان لوگوں کی آواز بھی اک دھوکا ہے  
 جو ابھی دنیا میں آئے ہی نہیں  
 صرف آواز ہے، آواز بھی اک دھوکا ہے  
 اور ہم دُھندے خیالوں میں سفر کرتے ہیں  
 کوئی مرکز ہی نہیں — کوئی کنارا بھی نہیں  
 دُور، نزدیک، قدیم اور جدید  
 فاصلے کچھ بھی نہیں، وقت کے آئنے میں  
 ایک سیلا سالگار رہتا ہے،  
 جس میں ہر دُور کے انسان نظر آتے ہیں  
 رقص کرتے ہوئے انسان ستاروں کی طرح  
 اپنی گمنام چمک رکھتے ہیں  
 بعض انسان مگر  
 ایسے چلتے ہیں کہ جیسے سورج  
 یہ دہ دیوار نہیں

جواندھیرے میں اُتر جاتے ہیں  
 اور جپ لوب کے آتے ہیں تو سورج کی طرح  
 اپنی گرمی سے جلاتے ہیں ہمیں  
 اور طاقت بھی عطا کرتے ہیں  
 جیسے خرابیں میں کسی عورت کا  
 جسم آتا ہے جلاتا ہے ہمیں  
 اور طاقت بھی عطا کرتا ہے  
 ان کی آواز سنو جو یہاں موجود نہیں  
 ان کی آواز چڑھتے تھے کبھی  
 ان کی آواز چواؤں میں گئے کبھی  
 اور ان لوگوں کی آواز سنو  
 جونہ آٹھتے، نہ آ میں گئے کبھی

ذوق القارا حمد نالبیش

## نظم

صیحدم اک تلاطم۔ گھلی آنکھ دکھ میں شر اپر نتھاں ک لب  
 لرزش پر گ دگل شاخ تاشاخ۔ چشم سیہ دھیتی  
 کون صحراء میں سوچ کی اندر ھی تمازت کو  
 باہنوں کے حلقة میں گھیرے ہوئے ہے  
 افق پر زمیں آسمان، تیرے ہو نٹوں کی مانند  
 پیورست باہم دگر

دین ڈھلنے راہ بھولی ہوئی اک کرن  
 چشم ولب، ہام ودر میں کسے ڈھونڈتی ہے  
 یہ سائے کو ہجرت سراۓ زمیں سے

نک کی طرف سراٹھائے گھرے ہیں

ہمارے دکھوں کو دلوں کے سوا اپ امان کون دے گا

اجھی رات ہرتے ہی تاریک گلیاں  
 سیہا در ڈھنی سے پدن ڈھانپ کے  
 پانے پہلے گناہوں کی یادوں میں آہیں بھریں گی  
 دریچوں کو چھوٹی گزرنگی ہوئی شب  
 دبے پاؤں - سبزے پانے نشان چھوڑ جائے گی  
 ہم بند کمروں میں چُپ چاپ سوتے رہیں گے  
 کے یہ ٹرمی ہے  
 کہ باہر نکل کر سیہ رات کی داستانیں ہستے

(نیا دُور)

# دیمک

کتابوں کی دشمن  
 کتابوں کی دشمن بھی ایسی کہ لفظوں کے رشتہوں کو نکیسر مٹا دے  
 غنیموں کے لشکر کی جاسوس بن کر  
 فضیلوں کے ہمراہ شہروں کو ڈھلنے کے سب گروپ تبا دے  
 قریوں ہو کہ سعنان ہو جائیں سب سالس لہتی ہوئی بستیاں ایک پل میں

خداوند حرف و معانی کی ہمیکیل کے پیدا رکا ہن  
 بولفظوں کے معبد میں آنکھوں کی شمعیں جلائے  
 نوشته کی تقدیر سے پانچ روپیں

کس افسردگی سے خدا اپنی نگاہوں کو رو داد ساری سنتے ہیں، دیکھو

یہاں سارے صفحے مرصع تھے پہلے  
 یہاں جد و لیں تھیں طلاقی  
 ہر درق سحر شنگرف سے جگھا آتھا مانند دستِ خانی  
 چہاں آج بخرا زمینوں کی وحشت بر سئے لگی ہے  
 چہاں آج شام و فا حرف کی نکھتوں کو ترسنے لگی ہے  
 وہاں خطِ گلزار و طاؤس کے موسموں کا گزر تھا

یہ پس خودہ و سمح اور اق اک تاز پایہ سوالات کا ہیں۔  
 خداوندِ روح و مسلم ہی بتائے  
 کہ ماڑا جی لفظ و قرطاس کیسا ہنر ہے  
 کتابوں میں مسٹی کے گھر آکے تعمیر کرنے کا فن  
 عظمتِ حرف و تقدیں میں معنی سے کیون بیے خبر ہے؟

(افکار)

## تہسیم کا شمیری

### جم کے اندر جنم کے باہر

میں نے زمین کی تلپتی رگوں پر ہاتھ دھرے ہیں  
 میں نے زمین کی تلپتی رگوں سے  
 تپتے لہو کو اُبلتے دیکھا ہے  
 ان رستوں پر، ان گلیوں پر  
 پتھر جیسی سخت ہوا کے  
 سُرخ دھماکے دیکھے ہیں  
 رات کی متورم گھر طویں میں  
 زرد مکانوں کے صحنوں میں  
 لہو کو گرتے دیکھا ہے  
 قطرہ، قطرہ، قطرہ

قطرہ قطرہ بنتے بنتے ایک سمندر  
 اک پے پامیں تپتا سرخ سمندر  
 زرد مکانوں کی رگ رگ میں تپتا سرخ سمندر  
 ان گلیوں کی پورٹھی چھال پہ عفریتوں کے جملے پھینیں  
 تپتی ژین کے ساتوں تلوتے تک لہراتی اندھی چھینیں  
 کتنی ہی طاطم صدیوں سے  
 انہدھی چھینیں میرے تپتے جنم کے جلتے خلیوں، زرد ساموں  
 کے دردیں میں بھٹک رہی ہیں  
 چھینیں میرے جنم کی اک اک رگ میں پورش کرتی ہیں  
 خوف کا اک تیکھا شکارا جنم کو کاٹا رہتا ہے  
 جنم کے باہر جنم کے اندر خون کا انداھا لا دا بہتا رہتا ہے  
 ان رستوں پر سرخ سمندر کی بلغاریں سہتا ہوں

(اوراق)

اظہر جاوید

## منافق دوستوں کے لئے ایک نظم

میں ہوں یے مہر پاروں کے جنگل میں الجھا ہوا  
 میں ہوں یے فیض چاہت کے جنگل میں ایسے کھڑا  
 جس طرح میرے چاروں طرف مصلحت کے لئے گھٹنے پر ٹھوڑا  
 جن کی چھاؤں میں بلیچھوڑو کاٹنے پڑیں  
 جن کی آواز سے خوف کے تیر دل میں کھبیں  
 یہ ستم کیشیاں، یہ چھائیں سمجھی  
 سر جھکاۓ کھڑی ہیں وفا میں سمجھی  
 سر نگوں پیار کی ہیں ادا میں بھی  
 میرے شعر ط کی تقدیس مامال ہے  
 میرے لفظوں کی حرمت بھی یہ حال ہے

میرے اخلاص پر ہیں سمجھی خندوان، غم رہا موجہ زن  
 میرے انکار میں، میرے انفاس میں،  
 میں بھٹکتا رہا، سر پٹختا رہا دکھ کی دلوار سے  
 دوستوں نے ملپٹ کر یہ لوچا نہیں، انسا سوچا نہیں  
 میں بھی انسان ہوں  
 مجھ کو بھی ہے تمنا کہ چاہے کوئی  
 میں نے جتنے بھی بلے لوث نقے کئے  
 ہمدوں کے لئے، سامنیوں کے لئے چاہتوں کے لئے  
 جتنے آنسو پڑنے جتنے پستے بنے  
 جتنے لمحوں کو الفت میں صدائُ کیا  
 زندگی کے جواں خون کو کیسے مالع کیا  
 بھیتے جی میں نے کیا کیا کیا  
 کاش ان کو بھی اک دین سراہے کوئی  
 میری سوچیں غلط، میرے ارمائیں بیٹ  
 میں نے چاہا کہ خوشبو سے دامن بھروں

قید ہاتھوں میں منج صبا کو کروں  
 میں اسی پاگل تھا جو بھول پیٹھا اسے  
 میں ہوں بے مہر پاروں کے چنگل میں اُبھا ہوا

(اوراق)

# گلمه

گلمه ہوا سے نہیں ہے ہوا تو اندھی بھتی  
 مگر وہ برگ کہ ٹڑی تو پھر ہرے نہ ہوتے ।  
 مگر وہ سر کہ جھکے اور پھر کھڑے نہ ہوتے ।  
 مگر وہ خواب کہ بجھرے تبے لشان ہٹھرے  
 مگر وہ ہاتھ کہ پچھڑے تو استخواب ہٹھرے

گلمه ہوا سے نہیں سُندھی ہوا نہیں  
 سہنسی کے تیر چلاتی ہوئی فضنا سے نہیں  
 مدد کے سنگ سے، اغیار کی جفا سے نہیں

گلہ تو گرتے مکانوں کے پام در سے ہے  
 گلہ تو اپنے بھرے ہوئے سفر سے ہے  
 ہوا کا کام تو چلتا ہے اس کو چلنا تھا  
 کوئی درخت گرے یار ہے، اُسے کیا ہے  
 گلہ تو اہلِ چمن کے دل و نظر سے ہے  
 خداں کی دھول میں لپٹے ہوئے شجرتے ہے  
 گلہ سحر سے نہیں رونتی سحر سے ہے

(نیا دور)

سہیل احمد

## اک ہوسم کے دوستوں کے لئے نظم

میں ویران تالاب کے پاس بیٹھا ہوں نہیں،  
ہوا چل رہی ہے،

درختوں سے گرتے ہوئے خشک پتوں کے انبار سے لک رہے ہیں  
پرانے مکاٹوں، درختوں سے آگے کھلے راستوں پر کوئی بھی نہیں ہے  
بس اک شام سرماکی اجر طمی ہوتی دھون پ ہے اور فکب پر  
اداسی میں ڈوبے ہوئے چند بادل ہیں جو راہ مجھوں لے ہوئے نتھے پتوں کی ماں د  
گُم سُم کھڑے ہیں

وہ کوئی نجیں بجوہ سال آتی ہیں اس مرتبہ ان کے آئے کی کوئی خبر بھی نہیں ہے  
وہ ہر سال آتی ہیں مہماں بن کر،

وہ ہر بار تالاب کے پاس کرتی ہیں اگر لسیرا،

وہ ہر بار ملتی ہیں مجھ سے  
 میں ہر بار کرتا ہوں کوئی نجوم سے باتیں  
 وہ مجھ کو سناتی ہیں، ہجرت کے رستوں، بہت دور کے سرد شہروں، نئے  
 پائیوں اور زارے علاقوں کی سب داستانیں  
 میں ہر بار ان کو بتاتا ہوں اس سال کیا کچھ ہوا ہے  
 میں اس بار بھی ان سے باتیں کروں گا  
 میں ان کو بتاؤں گا تالاب کے پاس بوڑھا شجر بوز ماں سے چڑلیں کامکن تھا  
 اس مرتبہ آندھیوں میں وہ گرد بھی چکا ہے  
 ادھر سمنے جو مکاں تھا وہ بارش میں ڈھے بھی گیا ہے  
 وہ لڑکی جو اپنی اداسی میں تالاب کے پاس پہروں گئی تھی بھی اب درے شہر  
 کو چاہکی ہے  
 چہاں صاف میدان تھا اب وہاں کچھ نئے گھر بنے ہیں  
 وہ کوئی نجیں میری ساری پالتوں کو سنتی ہیں مجھ کو سناتی ہیں بچھڑے ہوئے  
 درستوں کے فائدے  
 پھر اک روز وہ لوٹ جاتی ہیں اپنے گھروں، سرد مکوں میں چھوڑے ہوئے مسکنوں کو

مگر دوستی کے دن اُڑتے رہتے ہیں تالاب کے پانیوں پر  
 یہ دن پھر پھر آتے ہوئے ناچتے ہیں مری عمر کے سب دنوں پر  
 یہ دن اُڑتے جاتے ہیں سارے زمانوں سے آگے اب دگی حدود تک!  
 یہ دن اُڑتے پھرتے ہیں ہر سو بدقی ہوئی رُت میں کوئی جوں کے پھر لوٹ کر  
 مجھ سے ملنے کے اچھے دنوں تک!

(نیادور)

سرد صہبائی

## نائج لے نرٹگی

(موہنجو درو کی رقصاصہ کے نام)

نائج، ہاں نائج لے نرٹگی

نائج ان کے لئے جو چدائی کے صدمے میں ہیں

جن کی سانسوں کی دلپیز پر

اُن کے جسموں کے مہتاب گھنائے گئے

جو چکدار خواہش کی پوروں پر چڑھتی جوانی کی بیلوں کو پھوڑتے ہی سپھرا گئیں

نائج اُن کے لئے

جو جوانی کی پت چھڑ میں تنہائیوں کو پہن کر نکلتی ہیں

اور دصل کی رُت میں مہندی کی خوشبو سے ڈرتی ہیں

ہاں نائج لے سانولی ہا

کہ تیری انگلیوں میں پرے موسموں کے نزد بھاؤ ٹھہرے ہیں  
 تو خواہشوں کے قبیلے میں سورج کا گنگن پہن کر  
 جلت کے موسم کے تہوار میں ناچتی ہے  
 سلامت رہیں یہ ترے زرت بھاؤ، بُس بھاؤ  
 کہ ہم موت کے ناپلو میں زمانے سے ساکت ہیں  
 آنکھوں کی پتلی پہ صدیوں سے اک خواب کا عکس ٹھہرا ہے  
 اور تیرے ردش پدن کی مُہر را گئی کھو گئی ہے  
 بھڑک نزدیکی

کہ تیرے لہلہاتے بدن کے ترجم سے دن رات چڑھتے اُترتے ہیں  
 صدیوں میں پھیلی ہوئی سیر ہیوں پر ترے گنگھروں کی دھماک کو نجتی ہے  
 تجھے ہم نے جنمیں کی شکست میں دیکھا ہے  
 ماں ناج لے نزدیکی

ناج اُجڑے دلوں میں، اگہن تھور دہ آنکھوں میں  
 سنسان جسموں میں، تیرہ سیہ بخت گلیوں میں  
 ہاتھ زدہ آرزوں میں

ہم پر دیا کر  
کہ ہم موت کے تابو سے نکل کر  
ہمکتی ہوئی تازہ سائسون کے موسم میں جائیں  
ترتپ سانولی، ہاں چمک باؤلی  
جسم میں پھر پھرا تے لہو کے پرندے کے پکھوں  
گز نگے لہو کو مدھر خواہشون کے سروں میں جکا  
ہاں برس رس بھری

کامنی

پدمنی  
فرٹکی

کہ دلوں کے طبل پر تیرے پاؤں کی چمن چھنا چھن  
پیا بیان سینپول کی دفت پر تری انگلیوں کی چھما چھم  
ترتپ زریں  
کہ رکیں رخچ کے تاریں نہیں  
اور بدلن ایک آنگ تیرے مڈھر آگ کے تھر تھرائے سروں پر مکھل جائے

پوروں سے تیرے ترجم کی لذت کے چھرنے بہیں  
سانوں کی، مدھ بھری

تیرے چڑھتے اُترتے نر بھاؤ کی فاختا میں  
جنم در جنم، دلیں پر دلیں سارے گھروں کی منڈیوں پر اٹتی رہیں  
ماویں کی چھاتیوں میں ترے لس کا چشمہ پھوٹے  
تیرے پاؤں کی تلیوں کے تعاقب میں بچتے ہمیدشہ بھلکتے رہیں  
ناچ ہاں ناچ لے بُرگی

کہ ہم موت کے تابلو میں زمانوں سے ساکت ہیں  
اور تیری انکھوں میں کھویا ہوا اپنا پھپلا جنم مانگتے ہیں  
یہاں تیرے چڑنوں کی میٹی میں مانچتے سے ٹوٹا تک ڈھونڈتے ہیں

(پاکستانی ادب)

ریاض مجید

## دائمی رفاقت کی بشارت

جو رُبِّی سے بُری بات ہو سکتی تھی ہو گئی ہے  
جو بڑے سے بڑا اثر ممکن تھا وہ مجھ پر توڑا گیا ہے  
مگر میں ابھی زندہ ہوں — اور —

میرے عناصر کی ترتیب بجھری نہیں ہے  
ابھی رسماں سمت ہے اور سریں آوازہ شور و شرگو نجات ہے  
کہ آوارگی کے سفر کی ابھی ایک دومنزلیں اور بھی ہیں  
ابھی ذہن پر سورج کی وہ خراشیں نہیں ہیں جو اتنے زمانے میں پچھتا وابن پن کے  
رسقی ہیں اور بڑھے لمحوں کو دوزخ بنا دیتی ہیں  
ابھی آنکھ میں میرے دلکھے ہرٹے رنگ محفوظ ہیں اور صانی کی آواز  
ڈوبی نہیں ہے

ابھی مجھ کو اس کی رفاقت میر ہے جس کی محبت میرے جلتے سر پر  
 کسی مادرِ مہربان کی دعاوں کی مانند سایہ نگن ہے  
 ابھی شہر بھر سے نگاہیں ملانے کی ہمت ہے مجھ میں کہ میں سر بلند آج بھی ہوں

میں جیسا بھی ہوں مطمئن ہوں  
 اور ہر روز انکھوں میں خدا عنیادی و خوداً گھبی کی چمک لے کے گھر سے نکلتا ہوں  
 مگر میرے دشمن میں اتنی سکت ہی کہاں ہے کہ وہ میری جانب نظر بھی اٹھائے  
 کہیں شہر میں چلتا پھرتا نظر آتا ہے تو نگاہیں جو گھر کے گز رجاتا ہے  
 اُسے علم ہے کہ میرے ہاتھ پر ایک روشن زمانے کی آمد کا اعلان مرقوم ہے  
 اور وہ اس کو مٹانے سے قاصر ہے  
 (مجھے پانے دشمن کی بے چارگی پر بہت رحم آتا ہے)

(تحریریں)

انور محمود خالد

## دس دن پہلے

وہ دن کتنی تیری سے نزدیک آتا چلا جا رہا ہے  
 کہ جو میرے تیرے کے تعلق کی زنجیر کے نرم حلقوں کو  
 لگ کر درسے سے جدا کر کے  
 یوں وقت کی دھول میں گم کرے گا  
 کہ پھر یاد کی دیوبندی - کھلے سر  
 سہیلی پہ جلتا دیار کھکھ کے جب  
 دل کے پڑپتیج رستوں میں تہنا پھرے گی  
 تو وہ اپنی نم ناک آنکھوں سے خود دیکھ لے گی  
 کہ اس نامرادی کی تاریک شب میں  
 مجھے راستوں پر

مرٹی المفتوح کے کسی آہنی زنگ آلود حلقت کے ریزول کا نام دلشاں تک نہ ہو گا  
 محبت کے پرسوں سے قائم وہ مضبوط رشته  
 کبھی اتنے کردار ہو کر فراموش ہو جائیں گے  
 اس کا وہم و گماں تک نہ ہو گا!

وہ دن کتفتی تیزی سے بڑھتا چلا آ رہا ہے  
 مگر میں کسے یہ بتاؤں —

مرا دل سکوں کی الوہی حلاوت سے نا آشنا ہے  
 میں کیسے بتاؤں —

مقدار کے قاصنی کا کیا فیصلہ ہے  
 — یہی عمر بھر کی سزا ہے

ہمارے نصیبوں میں اک دوسرے کی رفاقت نہیں ہے  
 ہماری محبت

ادھورے المنک خواںوں کا وہ سلسلہ ہے  
 کہ بوجبے بہت پھیلتا چارہ ہے

مگر جن کی قسمت میں

پانی میں پھینکے ہوئے کنکروں سے بنے آن گذت دائرہ کی طرح  
اپنی مکمل خود کیسے کی مسترت ہنس ہے!

وہ دن کتنی تیزی سے بڑھتا چلا آ رہا ہے  
کہ جب آخری پار  
اک درسے کو خموشی سے ہم  
ڈپڈ بائی ہوئی آنکھ سے  
آنسوؤں کی زیال میں وہ پیغام دیں گے  
جہیں کیپکاتے ہوئے ہونٹ کہنا تو چاہیں گے  
لیکن نہ کہہ پا یہیں گے  
— اور آنکھوں کی سیال تحریر میں جو بلاغت ہے  
لفظوں میں کب ہے!

(تحریریں)

فهمید و ریاض

## جاگتی هستی

رات تملکتی ہے  
بے بسی کے پنجے میں  
لانپتی خصلی رات  
میری کوکھ میں ہر آن  
پل رہا ہے سفٹا  
اور میری تنہائی  
چوتھتی ہے سینے سے  
گرم دودھ کا دھارا  
عمر بھر کی کڑواہدھ  
پوچھنے لگی اک بار

نہ ہر یہ بھی پہنچا ہے؟  
 ساری رات چینا ہے؟  
 پھر یہ کیا دھیان آیا  
 شاست ہو گئی کایا  
 بھولے پسرے سنگی کا  
 کونی بول نرمی کا  
 پیارہی تو جوں ہے  
 میرے گرم ماتھے پر  
 میرے گرم ماتھے پر  
 کونی پیارہ کرتا ہے  
 جیسے نرم ہاتھوں نے  
 خٹک کر دیئے آنسو  
 بیتوں کی جھالرستے  
 ٹوٹنے لگے جبکہ  
 سور ہے سب سنار

چاگتی ہے بس مٹی  
 اس سے تو آنکھوں کے  
 نیج پھوٹتے ہوں گے  
 اب جو آئی پروائی  
 رات کی مہک لائی  
 یہ گمان ہوتا ہے  
 جس طرح مسرا پرمی  
 میرے پاس سوتا ہے

(پاکستانی ادب)

سردار کامران

## صحیح کی دعا

روشنی، میری ماں

چھاتیاں کھوں دے

پتنے سینے سے اگتی ہوئی پر کستیں میرے نزدیک لا  
میری آنکھوں کے غناٹک آتشکدوں پر جھڑک

میرے نزدیک آ

مجھ کو پانے لگے سے لگا

میرے ہر سمت پھیلے و ڈھنڈ لکوں کی تکڑیں کر

میرے پاؤں میں صدیاں، مسافت کے صحرائی زنجیر ہیں

نیست سے ہست ہب کے خلام میں ازل سے اپنک  
اکیلا ہوں میں

میرے ہر سو،

مرے جنم و جاں پر برستی  
سوالات کی کند تھیوں کے انبار میں  
میں تسب کے اس کھولتے زہر سے، مُرخ نا آنبے کے مانند ہوں  
میرا ایک ایک پل، بکراں پھلیتے رائروں کے سوا کچھ نہیں

میں افق تا افق، دم پدم۔ ایک صحرائی اڑتی بکھرتی ہوئی ریت ہوں

مجھ کو ہر سمت سے رو دھیا بازوں، زم ہاتھوں کے حلقتے میں بھر

میرے نزدیک آ

مجھ کو ہونے نہ ہونے میں

آشوبِ شکیک کی رزم گہہ میں، سرفراز کر

میرے چہرے کو اپنی دھڑکتی ہوئی چھاتیوں میں چھپا

پئے باطن کو ظاہر بنا

مجھ پہ ہر بھید کو کھول دے

نقط کو میرا مکوم کر۔ تاکہ میں  
 دوسروں کو سفر کی کہانی سننے کا کوئی وسیلہ ہنوں  
 تاکہ ہر ایک پر میری سوچوں کا ستم ستم کھلتے!

(اوراق)

ناہید قاسمی

## خانہ پروش

(۱) وہ سمعتی سکڑا میں ایک کونے میں دبکی بیٹھی ہے ننھی میلی کچلی گڑیا  
 وہ آن بلقیس کی نگاہوں میں کالی ڈائین ھھہر چکی ہے  
 نہ اس کی انکھوں میں کوئی موتنی  
 نہ اس کے گاروں پر کوئی لالی  
 نہ اس کے کپڑوں میں زنگ باقی  
 نہ کوئی آہنگ اس کی چابی میں  
 آج بلقیس کی سمجھی دوستوں نے اس سے کہا تھا:  
 "کوڑے کے ڈھیر پر اس کو ڈال آؤ  
 کہ اب یہ کالی گلوٹی ہم کو ڈراہی دے گی  
 چڑیل سی تو ہے، کھاہی لے گی:-"

(۲)

وہ میلے کپڑوں میں مسکراتا گلاپ ایسا شکفتہ لڑکا  
 پرانے درنوں سے بھر کے لایا ہے اپنی پوری  
 وہ ٹاٹ کی جھونپڑی کی جانب لپکتا جاتے  
 وہ کتنا خوش ہے  
 کہ آج کی رات جشن کی لمبی رات ہوگی

نہ ایک روٹھے گا دوسرے سے، نہ کوئی فاقتے کی بات ہوگی  
 کہ اس کی میلی قمیص کی جب میں ہے میلی کچلی گڑایا  
 جو اس کی گلنار، پرلوں جیسی حسین بہنا کے ڈرزوں سے ڈھلتے اشکوں کو  
 پونچھ دے گی

کئی دنوں سے وہ روٹھی روٹھی سی پاری ہی تسلی  
 گلاپ بھیجا کے پھیلے یعنے میں چھپ کے اس کو ہنا ہی دے گی  
 رُلاہی دے گی

(فتوں)

حامد بیلانی

کوئی دود سے بن جاتا ہے وہ دود

آدھی رات کو فون بجا

اور اپھری اک انجانی مغلوب صدا  
اپنی پیچخ کی دہشت سے  
ابھی ابھی وہ جاگی ہے معلوم ہوا

"بیضوی چہرہ

لبے صورت  
سر پر مٹنے تڑکے دوسینگ  
اور سینے کے وسط میں اک

پنج کوتی آنکھ  
آنکھ کی پٹلی میں میرا ہی عکس مقید  
آتش فشاں پہاڑ کی گہرائی سے اجھر کر

خونی پنجے  
بچنے بچنے کر،

کھدرے لپھے میں وہ چینا،  
اپنی مرضی کی تو صبح بستر پر

جسم نہیں  
مکڑی کا جالا پاؤ گی

میرا حکم ہے — آجاو  
اور پر ہمنہ ہوتے ہی  
مجھ کو چھو کر

میرے جیسی بن جاؤ

آجاو

آجاو

آجاو

..... ۴

پروین شاکر

## بائلیسوں صلیب

صبح کے وقت، اذال سے پہلے  
اپ سے بائیس پرس قبل۔ ادھر  
غم میں پہلی دفعہ روئی بھتی میں  
کرب میں ڈوبی ہوئی تیج سنی، تو مری مال  
ہنس دی بھتی

میری آواز نے اس کو شاید  
اس کے ہونے کا لیقیں بخشنا بھتا  
دکھ کے اک لمبے سفر اور اذیت کی کئی راتیں  
لبس کرتے کے بعد  
اس نے تنخیق کیا تھا مجھ کو

میری تخلیق کے بعد اس نے نئی زندگی پائی تھی جسے  
آنسوؤں نے مرے، سپتامبر دیا

ہر نئے سال کی چوبیس نومبر کی سحر  
دکھ کا اک رنگ نیا لے کے میرے گھرا تری  
اور میں ہر رنگ کے شایان سوگات کے لئے  
تندر کرتی رہی کیا کیا تحفے

کبھی آنکھن کی ہری بیلوں کی ٹھنڈی چھایا  
کبھی دیوار پر اگتے ہوئے پھولوں کا بخششی سایا  
کبھی آنکھوں کا کوئی طفلاں مرحوم۔ کبھی خوابوں کا  
کوئی شہزادہ کہ تھا قافت کا رہنے والا  
کبھی نیندوں کے مسلسل کئی موسم۔ تو کبھی  
جائگتے رہنے کی بے انت رُتیں  
درس میں بھیگی، ہوتی برسات کی کا جل راتیں  
چاند فی پی کے محلتی ہوتی چلپ راتیں)

وقت نے مجھ سے کئی دان لئے  
 اس کی باہیں۔ مری مصبوط پناہیں لے لیں  
 حد تو یہ ہے کہ وہ پے فیض نگاہیں لے لیں  
 زنگ تو زنگ تھے۔ خوشبوئے خاتک لے لی  
 سائیہ اپر کا کیا ذکر۔ رد اتک لے لی  
 کا پتے ہونٹوں سے موہوم دعا تک لے لی  
 ہر نئے سال کی اک تازہ صلیب  
 میرے بے زنگ دریچوں میں گڑی  
 قرضِ زیبائی طلب کرتی رہی  
 اور میں تقدیر کی مشاطرہ مجبور کی مانند۔ ادھر  
 اپنے خوابوں کا الہو لے مئے کر  
 دستِ قابل کی خابندی میں مصروف رہی  
 اور یہاں تک کہ صلیبیں مری قامت سنے  
 پڑی ہونے لگیں  
 ہاں کبھی نرم ہوانے بھی کوارڈوں پر مرے دستک دی

اور خوشبو نے بھی کچھ دھیر سے سرگوشی کی  
 زنگ نے کھیل رچا نے کو کہا بھی۔ لیکن  
 میرے اندر کی یہ تہماں طریقی  
 زنگ و خوشبو کی سکھی بن نہ سکی  
 ہر نئی سالگزہ کی شمعیں  
 میرے ہونٹوں کے بجانے  
 شام کی سرد ہوانے گل کیں  
 اور میں دیران دریچوں میں ڈھانے سر کو  
 خود کو تقسیم کے ناویدہ عمل میں سے گزتے ہوئے  
 بس دیکھا کی  
 آج اکیس صدیوں کو لپوڑے کے خیال آتا ہے  
 پانے پائیوں مہمان کی کس طرح پذیرائی کروں  
 آج تو ہمکھ میں آنسو بھی نہیں  
 ماں کی خاموش نگاہیں  
 میرے اندر کے شجریں کسی کو نپل کی مہک ڈھونڈتی ہیں

اپنے ہرنے سے میرے ہونے کی مربوط حقیقت کا  
سفر چاہتی ہیں

خالی سیپی سے گہرائیکی ہیں  
میں تو موتی کے لئے گہرے سمندر میں اُترنے  
کو بھی راضی ہوں ۔ مگر  
ایسی برسات کہاں سے لاڈیں  
جو مری مرگ بچاں روح کو بٹپھہ دے ।

(فتوح)

## نیلے پہاڑ

پھر بلا تے ہیں مجھے نیلے پہاڑ  
 دُور اُفُت پر آسمانوں سے بُلے  
 سبز پھر دل کی قطاروں سے پرے  
 پا پیادہ گاؤں کی جانب روائ  
 سادہ دل انچان بُڑھیا کی طرح  
 پادلوں کی گھٹڑیاں سر پر رکھے  
 پھر بلا تے ہیں مجھے نیلے پہاڑ

جانے کب قدموں کی زنجیریں کٹیں  
 چانے کب رستے کی دلواریں ہٹیں

قفل ٹوپیں حاضر و موجودے  
 جانے کب بادل کے رمظہ پر بیٹھ کر  
 بجلسیوں کے تازیا نے مارتا  
 پارشوں کے پانیوں میں جسیگتا  
 میں اڑاؤں آندھیوں کے راہوار  
 پھر بلاتے ہیں مجھے نیلے پھاڑا!

(ادراق)

سچا دیا ببر

## نامنا

مرے شہر میں اپنی ہوا

بہت خوب

آؤ تمہیں کیوں نہ میں شہر کی سیر کو لے چلوں  
 شہر کے مشرقی رُخ کی جانب سے آفاز کر لیں  
 یہ کہنہ فضیل اتنے رخزوں پہ ٹھرا ہوا جنم کے  
 نہالوں کی یلغار کو رکھتی ہے  
 لیں اب اس کی تعمیر کی گھڑی ہے!

یہ دروازہ، پرسیدہ اور زنگ خوردہ، کشادہ کشاوہ،  
 کوئی دن میں آرستہ ہونے والا ہے

آؤ چلے آؤ، بازار میں رکنا بہتر نہیں ہے  
 کہ بازار ہر دوڑیں ایک سے ہی رہے ہیں  
 یہ دیکھو، پرانے مکانات اب تک یہاں  
 پیچھے سے پیچھے چوڑے کھڑے ہیں  
 ڈرمت، ابھی ان کی قسمت میں ڈھینا نہیں ہے  
 مکیں دریختا چاہتے ہو تو آؤ گلی کی طرف سے چلیں گے  
 یہ گلیاں، یہ تاریک گلیاں ....  
 لس اب روشنی میں نہانے ہی والی ہیں؛  
 شاید تعقین سے گھبرا رہے ہوا  
 یہ بدو بوجھہری ہوئی ہے... کوئی پل میں بہنے لگے کی!  
 وہ دیکھو، مری ڈیورٹھی سامنے ہے

.....

چلے چاؤ! تم کون ہو؟  
 یوں مرے ساتھ کیوں آ رہے ہو؟!

## آذر تخت

### زندہ رہنے کی کوشش

کتنا اچھا لگتا ہے

کبھی کبھی جب سرورات میں ٹھنڈی ہوا یہی حلیتی ہیں

کبھی کبھی جب آسمان پر اُجلے بادل نئے نئے بہروپ بدل کر  
ہم کو حیران کرتے ہیں

کبھی کبھی جب کوئی پرانا سماحتی ہم سے ملتا ہے

کبھی کبھی جب وقت سے پہلے گھر کی چاٹ پڑتے ہیں

کبھی کبھی جب الماری کی ساری کتابیں  
دھوپ میں رکھے بیٹھ کر ان کو دیکھتے ہیں

کبھی کبھی جب کوئی چڑپا

دری سے چپ گرے کے روشن دان سے جائے کس کو صدائیں دیتی ہے

کتنا اچھا لگتا ہے  
 تم نے کبھی محسوس کیا  
 ان لمحوں میں ایک عجیب سی سکھ چادر بن جاتی ہے  
 ساری دنیا جیسے سمت کر کر منظر بن جاتی ہے

(انکار)

## اپنی موت پر ایک نظم

اور جب تم مجھے زہراً لود، فاسد زمین میں آتا رہ تو کوئی نصیحت نہ کرتا  
 مجھے یہ نہ کہنا کہ خوشبو تمہاری حفاظت کرے گی  
 مجھے ایسے اعلان کا حوصلہ بھی نہیں چل پہنچی، جس کا ہجھے عقیدت سے لکڑت زدہ ہو گیا ہے  
 مجھے یہ نہ کہنا!

ہماری دعا میں زمین تنگ ہونے کی منحوس عادت پہ غلبہ کریں گی  
 تمہارے لئے سب سوالات آسان ہوں گے  
 تمہارے لئے سپر لوبان کی پاس حلیتی رہے گی،  
 ہواں کی روتنی ہوئی دھنڈیں  
 بارشوں کی سُنکتی ہوئی ڈور میں  
 لمبے لمبے بگڑتے ہوئے چشم پر جب تعقّن کے گدھ آکے اُتریں

تو ان کو نجاست کے بہتان سے مت ڈرانا  
ا مہیں مت ڈرانا کہ وہ مجھ سے ہیں

میری شاخوں پر بھتنا ہوا خون مصرف کے چنگل میں بھما ہوا  
جانکشی کے عمل سے گذر لے لگا ہے  
اور جب تم مجھے پانتے بیزار کاندھوں پر لے کر چلو گے تو بازار کے لوگ  
اپنی گواہی کا تریاق دیں گے

میں اپنی گواہی پر زندہ تھا  
اب چل بسا ہوں  
کہ لفظوں کی تاجر ہوا میں کسی سنگدل دلیں کو اڑا گئی ہیں  
اور جب تم زمیں کے مقفل کو اڑوں کو کھولو !  
وہاں کالی مسمٹ کا تالاب ہو گا  
اگر اس میں قرنوں کے سب جانور بھوکی آبکھوں سے میرا سوگت کریں  
تو مجھے مسترد کر کے تم لوٹ جانا

اور جب تم مجھے مشرک کاوشوں سے زمیں میں اتا رو،  
تو آواز دینا

رفیقو!

کہ ہم اس زمیں سے مکمل ہیں  
یہ خاک صورتِ مکال دیر پا ہے

رفیقو!

یہ بیادِ رسموں سے پہلو تھی کرنے والا عقیدت سے خود کو سپردِ زمیں  
کر رہا ہے

تمہیں جب دراثت کے جھگڑوں سے فرست ملے  
 تو کسی روز میری جپیں پر کوائف کی تختی لگانا

کہ پہچان ہوتی ہے

اور سکوؤں کے پچے بہت شوق سے ایسی تحریریں رپڑتے رہیں

(اوراق)

## ظفر سلطان

### راہباؤں کے نام

تمہارے اجلے بدن سے برگد کا پیڑا اچھا  
 کوئی مسافر جو تھک کے بیٹھئے تو دو گھنٹی کو قرار پائے  
 تمہارے اجلے بس سے بارہاں اچھا  
 جواں سمندر کی تیر موجود میں زندگی کا لقیس دلائے  
 تمہاری زلغوں کی چھاؤں سے ساہاں بہتر  
 جو بادلوں کی ستم طریقی پہ اپنی رحمت کو عام کر دے  
 تمہارے ہونٹوں کے چھوٹے لیے  
 جو اپنی خوبصورتی سے جی چڑائیں  
 تمہاری آنکھوں میں خراب اتریں

تو اپنی تعبیر بھول جائیں  
 تمہارا اپنا وجود چاندی کا کھوٹا سکھ  
 جو جیب قدرت میں چانے کب سے پڑا ہوا ہے  
 نہ چلتے کب تک پڑا رہے گا

(پاکستانی ادب)

## جمیل مک

### تیسیم شماںل پوری کی بادیں

نہ ایسے طے کبھی یار ووف کا مرحلہ ہو گا  
 "خرام اُبر کی صورت وہ آیا بھی تو کیا ہو گا  
 وہ لیوں تو دیکھنے میں سامنے پیٹھا ہوا ہو گا  
 مگر اک سانس کی ڈوری کا رشته کٹ جوچکا ہو گا  
 کبھی پارش میں وہ چھم چھم چھا چھم بہہ کیا ہو گا  
 کبھی قوس قزح سے زنگ بن کر جھانکتا ہو گا  
 کبھی مہتاب راتوں میں تیسیم کی صبا ہو گا  
 کبھی وہ پھول سے چہروں پہ شبنم کا دیا ہو گا  
 چون زاروں میں دیکھو وہ گلوں سے کھیلتا ہو گا  
 نظر آتا نہیں تو خود بھی خوشبو بن گی ہو گا  
 گھنیرے جنگلوں میں کشتی پر سائیں ہوتی ہوں گی  
 پپیها، پی کہاں ہے، پی کہاں ہے، چینتا ہو گا

محبت کے ستارے اس کی آنکھوں میں چمکتے تھے  
 نلک پر چینپوؤں کے شہر میں وہ جا بسا ہو گا  
 سحر ہو گی تو اترے گا حسین کرذل کے نیٹے سے  
 دیئے کی لو میں شاید رات بھروہ کا نیتا ہو گا  
 نیکم چال فرا ہو یا سکوت شام ہمیراں ہو  
 وہ کس کس روپ میں آتا کے ہم سے بو لتا ہو گا  
 بھرے شہروں کو تہنا کر دیا جس چانے والے نے  
 ذرا سوچو وہ خود بھی کتنا تھا ہو گیا ہو گا  
 لکھی آنکھوں جمالِ روئے ناپاں کس نے دیکھا ہے  
 مندی آنکھوں سے وہ حسنِ دو عالم دیکھیا ہو گا  
 ہر اک دل میں چک اس کی ہر اک لب پر ہر اک کی  
 سبھی کا آشنا تھا وہ تو کس کا آشنا ہو گا  
 جیل اب فرق کیا باقی ہے ہونے پاٹھ ہونے میں  
 جُدا ہم سے ہوا تھا وہ ہمیں سے آ ملا ہو گا

(ادراق)

## اسرار نیدی

### اپنی ذات کا نوحہ

سفر کی شب کتنی مختصر ہے  
 پہشب زمان و مکان کی گردش کے  
 عرصہ بے شر کا حاصل؛  
 پہشب اذیت سے بہرہ در ہے  
 سفر کی شب کتنی مختصر ہے!

چہاں قیام دسکون کے لمحوں میں  
 صرف بے روح قربتوں کا غبار  
 کوہِ الہم کی سفاک گھاٹیوں میں محل رہا ہے  
 جھلستے صحراء ہوا گلتے ہرئے بیان

چھنٹے ریکڑا رکیا کیا دھانی کریں گے  
دکھوں کے متواج بحر جن کے عمق کی تہ میں  
کئی دفینے چھے ہوئے ہیں  
کئی سفینے تھے ہوئے ہیں

بچھڑتے والے اپنی خلمت کے پر جمپوں کو  
اڑاتے منزل پہ جا گزیں ہیں  
سلگتی روحوں کے کرب کیسے سمدٹ سکیں گے  
دکھوں کے اس دوہرے کرب سے روح پیخ اٹھی ہے  
بچھڑنے والوں کی موت کا غم ہی جانگسل تھا  
خود پانے ہونے کا کرب بھی کچھ  
عذاب دوزخ سے کم نہیں ہے  
سفر کی شب کتنی مختصر ہے

(قند۔ مجید احمد نیرا)

مسعود منور

## محمد امجد کے لئے ایک سوڑ

نہ یہ موسم پیلو لایا نہ دن چڑھا جوانی  
 نہ اپ چند پتھر کش لٹکے نہ اپ ٹھٹے کافی  
 دُور دُور تک کھڑے سر وٹے دُور دُور تک پانی  
 کس سے ہو سنجوگ سجن کا، کون کسی کا ہاںی

بائیں اس کی چوں سفشتی، جن کی پاس نویلی  
 اس کی نظم خانی سپنا چیز کڑھی کیلی  
 اس کا لہجہ شبہم بھیگا، روت کی سبز پہلی  
 پار محمد امجد کیا، بچھڑے بچھڑگ یہ ہریلی

چھڑے پار مناؤں کیسے، کیسے ان کو لاؤں  
 قبر کو جانے والا رستہ بند برابر پاؤں،  
 لیکن جب میں چلتے چلتے، چلنے سے تھک جائیں  
 تیری بند کتاب کے اندر نظم کے دریاں آؤں

(قند)

اُردو غزل کی نئی جہت

(دوسرا ایڈیشن)

غزل

وزیر آغا

قیمت دس روپے

مکتبہ اردو زبان (بلوئے وڈ بسگروہ)